مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

# تلمیذِ انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ

۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت ندوہ میں پڑھتا تھا، درس کے دوران اور بحث وتحقیق کے سلسلہ میں، مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتا تھا، ہمارے استاذ مولانا حیدر حسن خان صاحب شاہ صاحب سے بخوبی واقف تھے، ان کی مجلس میں شاہ صاحب مرحوم کی وسعتِ علم، بے نظیر حافظہ، ندرتِ فکر، اور دقتِ نظر کا ذکر آتا تھا، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض شاگرد بھی کبھی کبھی آجاتے اور اپنے استاذ کے علم وکمال کا والہانہ ذکر کرتے، گرمیوں کی چھٹی میں مولانا سید طلحہ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور، لکھنو آتے، مولانا حیدر حسن خان صاحب مرحوم ان کے شفیق استاد تھے، ٹونک ان کا وطن تھا، اس طرح تلمذ کے ساتھ وطن کی مشارکت بھی ان کو ندوہ لاتی اور بعض اوقات کئی کئی دن مولانا حیدر حسن خان صاحب کے ہاں ان کا قیام رہتا، مولانا طلحہ کی عقیدت اور مولانا حیدر حسن خان کی شفقت قابلِ دید ہوتی۔

مولانا سید طلحہ صاحب نے مولانا انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو قریب سے دیکھا تھا اور ان کے حلقہ درس میں کئی بار بیٹھے تھے، ان کی مخصوص صحبتوں میں بھی شریک ہوئے تھے، علوم اسلامیہ پر خود ان کی اچھی نظر تھی، خصوصاً تفسیر، حدیث اور رجال کا بہت اچھا مطالعہ تھا، حافظہ بھی غضب کا پایا تھا، لیکن بایں ہمہ وہ شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے اور ان کی وسعتِ نظر، حفظ واتقان، مہارتِ علوم اور مجتہدانہ صلاحیت کے بے حد معترف تھے، ان کا تذکرہ بڑے کیف ووجد کے ساتھ کرتے، کہا کرتے تھے کہ: اگر میں نے مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نہ دیکھا ہوتا اور ان کے حافظے کا ذاتی تجربہ نہ ہوتا تو مجھے ان روایتوں کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا، جو کتابوں میں سلف کے حافظے کے بارے میں درج ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ جس امت کے پچھلوں کا یہ حال ہے اس کے اگلوں کی کیا کیفیت ہوگی۔

یہ باتیں سن کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی شاہ صاحب علیہ الرحمۃ سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی، دیکھنے

ان کی توجہ سے شائع ہوئیں ۔ ملک کی تقسیم کے بعد انہیں بھی پاکستان جانا پڑا، لیکن ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں وہاں بھی جاری رہیں' بلکہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں انہوں نے علم ودین کی خدمت کی ۔

کراچی میں ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی، جس نے ان کی زندگی ہی میں بڑی مرکزیت حاصل کر لی، اس درس گاہ کے ساتھ ایک ماہنامہ ''بینات'' بھی جاری کیا جو وقیع علمی ودینی مضامین کی وجہ سے بہت ممتاز ہے۔ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی عربی مدارس کے درمیان کوئی رشتہ ارتباط نہیں تھا، وہاں کے سرکاری حلقوں نے اس انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہا، اوران مدارس کو سرکاری سرپرستی میں لے کر مشرقی امتحانات کا مرکز بنا دینے کی کوشش کی ،لیکن مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے بڑی ہمت سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا۔ اور آزاد عربی مدارس کا ایک وفاق بنادیا' جو بہت مفید ہوا۔

جو حضرات عربی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا۔ اس کامیابی سے ایک طرف ان کے اثر ورسوخ کا اندازہ ہوجاتا ہے، اوردوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں دینی اور علمی حلقوں میں کتنا اعتماد حاصل تھا، ان اہم کاموں کے علاوہ انہوں نے وہاں لامذہبیت اور بدعقیدگی کو بھی روکنے کی کامیاب کوشش کی ۔ اس سلسلہ میں بعض اوقات انہیں حکومت سے بھی ٹکر لینی پڑی ،لیکن انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی ، ان کی اس ہمت اور استقامت کو دیکھ کر بعض دوستوں نے بے ساختہ کہا کہ یہ کسی بنوری ہی کا دل وگردہ تھا، ورنہ جنرل ایوب کے فوجی اقتدار کے زمانہ میں ایسی جرأت کی توقع کسی سے مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی۔

وہ سیدنا حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس اللہ تعالیٰ سرہ' کے نامور خلیفہ حضرت شیخ سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اوران کے اندر دینی حمیت ،تجدیدی روح ،اوراستقامت وثبات قدمی انہیں کی وراثت کی بنا پر آئی تھی' جو شاہجہان کے شان وشکوہ اوراس کے صاحبِ اثر وزیر سعد اللہ خاں کے جاہ وجلال کو خاطر میں نہیں لایا، اس کا نام لیوا ایوبی حکومت کی کیا پروا کرتا، ان کی ہمت واستقامت نے بہت سے ڈگمگائے ہوئے قدموں کو سہارا دیا، الحاد وبے دینی کے اڈے ٹوٹ گئے ،اور ملحدین کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

مسلم ممالک میں بھی ان کا بڑا اثر تھا، اور اکثر اسلامی اور دینی کانفرنسوں میں انہیں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی ،اوران کے علم وتجربہ سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا، میرا ان سے ملنا جلنا زیادہ نہیں ہوتا تھا' مگر جب مل جاتے تو بڑی محبت سے پیش آتے ۔ ۱۹۶۷ء کے موسم حج میں ان کے والد صاحب بھی ساتھ تھے' مجھے ان سے خاص اہتمام سے ملایا، اور میرا تعارف ان سے بڑی تعریف وتوصیف سے کرایا۔ جب بھی ملاقات ہوتی' بڑی خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ ملتے ، آخری بار ۱۹۷۴ء میں مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی، اس وقت کمزور بہت تھے، پیدل چلنا دشوار تھا' اس لئے سعی گاڑی پر کر رہے تھے، آخری ملاقات وہیں مسعیٰ میں ہوئی ۔ پھر اس کے بعد ملنے کا موقع

نہیں ملا، کئی مہینہ سے ان کی بیماری اور کمزوری کی خبریں آ رہی تھیں، بالآخر وقت موعود آ پہنچا اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے، ان کے مراتب بلند فرمائے، اور ان کے جانشینوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

انہوں نے علم دین کی خدمت کے لئے جو ادارے قائم کئے تھے، امید ہے کہ وہ برابر ترقی کرتے رہیں گے اور ان کے دائرہ کار میں مزید توسیع ہوتی رہے گی، تصانیف کے جو مسودے مکمل ہو چکے ہیں، ان کی طباعت کا انتظام جلد ہونا چاہئے، اور جو ابھی نامکمل ہیں، ان کی تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے، اس بارہ میں جامع ترمذی کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے، امید ہے کہ ان کے لائق جانشین اس کی تکمیل اور اشاعت کا خاص فکر کریں گے۔

(بشکریہ "معارف" اعظم گڑھ)

"پاکستان آج اپنی تاریخ کے انتہائی نازک ترین دور سے گزر رہا ہے، دنیا میں انقلابات آتے ہیں، سازشیں ہوتی ہیں، طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ آج کسی کے لئے تخت سلطنت ہے تو کل اس کے لئے تختہ دار ہے یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن ہمارا ملک اس سے بھی شدید ترین خطرات سے دوچار ہے۔ داخلی اور خارجی فتنوں نے اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اس کو گھیر رکھا ہے۔"

(بصائر و عبر۔ محرم الحرام۔ ۱۳۸۹ھ)